برسوں کے لیے..آئندہ صدیوں کے لیے..

تو میں ڈبیا کے تابوت میں سے ٹٹولتی اُنگلیوں سے نکلی اگرچہ باون میں سے صرف ایک ماچس کی تیلی تھی لیکن وہ جو ایک عام سی اگرچہ خوش چہرہ لڑکی تھی..میری بدولت دوام میں بدلی..

میں نے اپنی چند ساعت کی حیات میں اُن دونوں کے چہروں کو..جو پلٹ کر دیکھتا تھا اور جو اُسے ششدر ہو کر دیکھتا تھا..ان دونوں چہروں کو متغیر ہوتے..ایک ہی مختصر لمحے کی بھڑک میں..انسانوں سے حیوانوں میں بدلتے..مکمل طور پر خود سپردگی اور فنا میں غرق ہوتے دیکھ لیا تھا..لیکن میں آپ سے بالکل سچ کہوں گی..جو کہوں گی دین ایمان سے..اگر ماچس کی ایک تیلی کا کوئی دین ایمان ہوتا ہے..تو بالکل سچ سچ کہوں گی..کہ میں محض ماچس کی ایک تیلی ہوں جس کی حیات بھڑک کر.. بجھ جانے کے درمیان..ایک پلک جتنی دیر میں جھپکی جاتی ہے اُس وقفے کے درمیان حیات ہوتی ہے تو میں بالکل سچ کہتی ہوں کہ اس لمحے میرے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ دونوں..جس نے پلٹ کر دیکھا..اور جس نے اسے میری روشنی میں پلٹتے ہوئے دیکھا..یہ دونوں آئندہ سارے برسوں..ساری صدیوں میں یونہی ایک دوسرے کے لیے حیوان ہی رہیں گے اور کبھی بھی عام انسان نہ ہو سکیں گے..یہ میرے گمان میں بھی نہ تھا..اُس بھڑک کے عارضی لمحے میں!

اور یہ بھی میرے گمان میں ہرگز نہ تھا کہ پلٹنے والے چہرے کی جانب سے اُس کے آخری خط میں مُردہ شاعرہ کا ایک شعر ہوگا جو اس بنجر شخص کے ضمیر میں ایک کانٹے کی طرح چُبھتا رہے گا..

میں تو کسی مردہ تو کیا..زندہ شاعرہ کو بھی نہیں جانتی تھی کہ میں محض ماچس کی ایک تیلی تھی..جو پل بھر کے لیے بھڑکنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ناکارہ اور مُردہ ہو جاتی ہے اور وہ دونوں آگے چلے گئے تھے اور میں کسی ایک سیڑھی پر اُسی مُردہ حالت میں پڑی رہ گئی تھی اگرچہ میرے مساموں میں اس چہرے کا جمال رچ گیا تھا جس نے پلٹ کر میری روشنی میں اسے دیکھا تھا..

میں کسی ایک سیڑھی پر پڑی رہ گئی تھی..

اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کونسی سیڑھی پر..باون میں سے بیسویں یا تیسویں سیڑھی پر..گری پڑی رہ گئی تھی اور وہ آگے چلے گئے تھے..وہ مجھ پر پاؤں دھر کے..وہ بنجر شخص..نیچے اُتر گیا تھا...

میں کسی ایک سیڑھی پر مردہ پڑی رہ گئی تھی اور مجھے تاریکی سے ڈر لگ رہا تھا..مردہ تھی

لیکن اُن کے اُترتے قدموں کی چاپ سن رہی تھی.. وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے گلی میں نکل گئے تھے اور اب سیڑھیاں ویسے ہی تاریک اور خاموش تھیں جیسے ان کے اترنے سے پیشتر تھیں..

اگرچہ میرے سارے مساموں میں اس پلٹنے والے چہرے کا جمال رچ گیا تھا لیکن میں اسے آنکھ بھر کے دیکھ نہ سکی تھی.. میں خود روشنی کے جھماکے میں تھی اور میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں.. سیڑھیوں پر مردہ پڑے مجھے ایک اور خیال آیا.. میری آنکھیں اس لیے چندھیائی تھیں کہ اُس چہرے میں سے چکا چوند سورج طلوع ہو رہے تھے..

میں ماچس کی ایک تیلی پھر سے اندھیری ہو چکی باون میں سے کسی ایک سیڑھی پر پڑی اپنے انجام سے مطمئن تھی.. کہ میرا جلنا کام آ گیا.. دُنیا کی باون تیلیوں میں سے یہ میرے نصیب میں تھا کہ اپنی فنا سے پیشتر ایک بھڑک سے دو انسانوں کو حیوان کر جاؤں.. کہ انسانوں کی محبت میں اتنی پائداری نہیں ہوتی..

اتنے ڈھیر سارے برسوں کے بعد میرا جی چاہتا ہے کہ اُس بنجر شخص کو ایک خط لکھوں اور اپنا احسان جتاؤں کہ یہ صرف میں تھی جس کے بھڑکنے سے تم پھر ہرے بھرے ہو گئے تھے.. ابھی تک ہو.. لیکن میرے پاس اُس کا پتہ نہیں ہے.. یہ خط اگر لکھوں تو کس پتے پر لکھوں.. کس ڈاکیے کے حوالے کروں جو اُسے.. جہاں وہ ہو وہاں اسے پہنچا دے..

میرا جی چاہتا ہے کہ اُسے ایک خط لکھوں..

یہ سب کچھ ماچس کی ایک تیلی کا کیا دھرا تھا کہ اب عشق.. نڈھی کے تھاؤں تھائیں بول رہا تھا..

بدن کا ہر مُو جب بولتا ہے تو ڈُھنڈیا پٹ جاتی ہے.. کُل جہان کو خبر ہو جاتی ہے.. چہار سُو لاؤڈ سپیکر لگ جاتے ہیں، عشق کے اعلان ہونے لگتے ہیں.. زمین پر جتنی بھی مخلوق سانس لیتی ہے اُسے تو خبر ہو ہی جاتی ہے لیکن زمین کے اندر کے مکین بھی جان جاتے ہیں کہ اوپر ایک نڈھی کے تھاؤں تھائیں عشق بول رہا ہے کہ اس عشق کی ایک دھمک ہوتی ہے جو زیرِ زمین بھی سنائی دیتی ہے.. عشق کا ہاتھی.. پوش کریندا پوش.. ہر شے کو روندتا چلا جاتا ہے..

جب ڈُھنڈیا پٹ جائے.. عشق کی دھمک زیرِ زمین بھی سنائی دینے لگے.. لاؤڈ سپیکروں پر اعلان ہونے لگیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ شکاری کو خبر ہی نہ ہو کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے.. نڈھی اس کی بیٹی اگرچہ خاموش رہتی تھی لیکن اس کے بدن کے ہر مسام ہر مُو سے عشق بولتا تھا. تو اُسے کیسے خبر نہ ہوتی..

میں اسی شکاری کی بندوق ہوں.. بیکال ہوں یا پریڈی اس سے آپ کو کیا غرض.. میں محض مرغابیاں نہیں انسانوں کو بھی ہلاک کر دینے پر قادر ہوں..

ذرا ٹھہریئے.. بندوق کی سرگزشت سے پہلے میری بھی ایک مختصر سی کہانی ہے کہ میں عام چمڑے سے بنی ہوئی ایک ایسی بیلٹ ہوں جو پتلون کو ڈھلکنے سے بچاتی ہے اور میں شکاری کی پتلون کی بیلٹ ہوں.. شکاری اس پختہ یقین میں تھا کہ نڈھی یعنی لڑکی کے ہر موئے بدن سے جو عشق بولتا ہے وہ اس بیلٹ کی زد میں آ کر دم توڑ دے گا.. منت سماجت کرے گا.. ہمیشہ کے لیے

چپ ہو جائے گا.. زیر زمین رہنے والے بھی اطمینان کا سانس لیں گے اُن کے کانوں تک کوئی دھمک نہیں پہنچے گی اور وہ سکون کی نیند سو سکیں گے..

چمڑے کی بیلٹ کو ایک کومل بدن پر استعمال کرنے کی نوبت تب آتی ہے جب پیار چمکار.. واسطے.. منت سماجت.. عزت اور ناموس کے حوالے.. دھمکیاں اور خاندانی وقار کے آزمودہ گُر کارگر نہیں ہوتے..

مجبوراً چمڑے کی بیلٹ کو پتلون سے کھینچ کر نکالا جاتا ہے اور ایک دُرّے کی صورت استعمال میں لایا جاتا ہے..

اُس کا.. نڈھی کا.. بدن اشکولے کی کنواریوں ایسا تھا جس پر جب چمڑے کی بیلٹ.. یعنی جو میں ہوں.. میرا پہلا وار ہوا تو وہ بدن جو کسی بھی اذیت سے آج تک نا آشنا تھا.. حیرت بھرے سناٹے میں آ گیا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے.. اس اذیت نے بدن پر عشق کے بولنے والے ہر مُو کا دم لحظہ بھر کے لیے روکا.. اس رکاوٹ کو برداشت کرنے کے لیے اُسے چیخنا تھا اور وہ چیخی..

اُس کی چیخیں نہ صرف ساتھ والے گھروں بلکہ پورے قصبے پر تیرتی دوہائی دیتیں.. گھر گھر کو جاتی تھیں..

مجھے.. یعنی چمڑے کی بیلٹ کو اچھا نہیں لگا کہ میں جو محض پتلون کو ڈھلکنے سے روکنے کے لیے بنائی گئی تھی.. مجھ سے ایک کومل بدن کو پاگل پن سے بے دریغ پیٹا جائے.. لیکن میں کیا کر سکتی تھی.. بے اختیار تھی.. شکاری کا ہاتھ مجھے گھماتا تھا اور مجھے وہی کرنا تھا جو وہ چاہتا تھا.. میں بدن کے نشیب و فراز پر پوری شدت سے وارد ہوتی اور اُس پر نیلے نشان چھوڑتی جاتی.. تا آنکہ اُس کا تن من نیلو نیل ہو گیا.. وہ اگرچہ پیدائش سے لے کر اب تک دُودھیا رنگ کی تھی لیکن میری وجہ سے وہ نیل کی نیلاہٹ اذیت میں رنگی گئی..

لیکن وہ بہت ڈھیٹ ثابت ہوئی.. جیسے ایک جانور ڈھیٹ ہو جاتا ہے.. میری زد میں آ کر اُس کا ایک مُو بند ہوتا تو دوسرا کھل جاتا اور عشق بولنے لگتا..

برداشت کی ایک حد ہوتی ہے اور وہ اس کے پار اُتر چکی تھی۔ ایک کچے گھڑے پر..

وہ ناممکن کے حصول کی چاہت میں گرفتار تھی.. کہ اُسے جس کے ساتھ نتھی کیا جا چکا تھا وہ اُسے ترک کر کے وہ کچھ حاصل کرنا چاہتی تھی جو لاحاصل تھا.. وہ حساب کتاب کرنے کے قابل

نہ رہی تھی کہ ایک مست مُنہ زور ہاتھی تلے کچلی گئی تھی..

ع حافظ ہاتھی عشق دا پوش کریندا پوش..

ہٹو بچو.. ہٹ جاؤ راہگیرو.. پوش پوش کہ.. عشق کا ہاتھی چلا آ رہا ہے جو اندھا اور پاگل ہو چکا ہے.. کسی کا.. جو اس کا راستہ روکے لحاظ نہیں کرتا.. دریغ اس کی لغت میں شامل نہیں.. وہ روند دیتا ہے.. تباہ کر دیتا ہے جو کوئی بھی اس کے راستے میں آئے.. تو شکاری کو شاید احساس نہ ہوا لیکن میں چمڑے کی بیلٹ جو اس کے کومل بدن کو ادھیڑتی تھی میں جان گئی کہ بے شک میں ساری عمر اس کے شفاف چمڑے پر برستی رہوں تب بھی اُس کے ہر مُو سے عشق نے بولنا تھا.. کہ وہ عشق کے ہاتھی تلے روندی گئی ایک تباہ شدہ لڑکی تھی..

میں نے ہتھیار ڈال دیئے..

میں نے کہا' شکاری آپ تھک گیا اور اس نے مجھے رکھ دیا..

جب میں کارآمد ثابت نہ ہو سکی تو شکاری کی جھنجھلاہٹ نے بندوق کو کھونٹی سے اتار لیا..

اب میری.. چمڑے کی بیلٹ کی کہانی ختم ہوتی ہے اور میرے بعد جو کچھ کہے گی کھونٹی سے اُتری ہوئی شکاری کی بندوق کہے گی..

میں بیکال ہوں..

پریڈی نہیں ہوں..

جھیل بیکال کے نام والی شکاری کی وہ بندوق ہوں جسے وہ اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر چاہتا تھا اسی لیے اُس نے مجھے اپنی اولاد پر استعمال کرنے کی ٹھانی..

مجھے بے حد حیرت ہوئی.. مجھے یقین نہ آ سکا.. کہ یہ میری حیات میں پہلی بار تھا جب میری نالی کا رُخ جھیلوں میں اُترتی.. تیرتی.. یا اُن پر اُڑان کرتی مرغابیوں کی جانب نہ تھا.. ایک انسان کی جانب تھا.. شکاری کی بیٹی کی جانب تھا..

اگرچہ میرا کام ہلاک کر دینا تھا چاہے وہ ایک آبی پرندہ ہو یا انسان لیکن مجھے مرغابیاں مارنے کی عادت ہو چکی تھی اور میں اپنی ہر ذی روح کو ہلاک کر دینے والی خصلت کو بھول چکی تھی۔ اسی لیے جب میری نالی کا رُخ ایک انسان کی جانب ہوا.. نشانے کی مکھی میں ایک آنسوؤں سے بھرا چہرہ نظر آیا تو میں اس تبدیلی کی تاب نہ لا سکی.. یہ نہیں کہ میں نے فائر کرنے سے انکار کر دیا کہ

میں بھی چمڑے کی بیلٹ کی مانند بے بس اور بے اختیار تھی بلکہ میرے وجود کے اندر جتنی بھی بے دریغ ہلاکت تھی وہ بزدل ہوگئی..

کیا میں اسے بیان کردوں جو میری نالی کی زد میں تھی اور تھر تھر کانپتی جاتی تھی.. وہ ایک زرد پڑتا سنہری چہرہ تھا.. کچا.. کوئی نادان اور یہ سمجھنے والا کہ عشق دنیا کو زیر کرسکتا ہے.. فتح کرسکتا ہے.. یہ جانے بغیر کہ تمام تر داستانوں کے باوجود عشق کی کوئی حیثیت نہیں.. یہ خلل ہے دماغ کا..

اسے کئی روز تک ایک کمرے میں بند رکھا گیا تھا..

یہ کمرہ تو دراصل نہیں تھا گھریلو کاٹھ کباڑ کا سٹور تھا اور چونکہ کاٹھ کباڑ کو روشنی اور ہوا کی حاجت نہیں ہوتی اس لیے یہاں ان دونوں کی کمی تھی جو محسوس نہیں کی جاتی تھی کیونکہ جو بھی اس میں آتا تھا پل دو پل کے لیے آتا تھا اور کوئی ٹوٹی ہوئی میز، خالی کارٹن یا کار کی بیکار ہو چکی بیٹری وغیرہ رکھ کر چلا جاتا تھا.. اُسے بھی وہاں رکھ کر.. وہ دھکیل کر چلے گئے تھے.. یہ دھیان بھی نہ رکھا تھا کہ ایک انسان کو ایک باتھ روم کی حاجت ہوتی رہتی ہے.. اس لیے وہاں متروک اشیاء کی بوسیدگی کے سوا ایک اور بُو بھی تھی.. ماں کبھی کبھار چوری چھپے اس سے نظریں ملائے بغیر کھانے کو کچھ رکھ جاتی تھی..

لیکن میں نے اسے تب دیکھا جب اسے گھر کے مختصر صحن میں لایا گیا.. صحن کی بلند دیواروں سے کچھ بیلیں خوف سے چمٹی ہوئی تھیں.. وہ ابھی تک اُسی پیلے سوتی پیراہن میں تھی جو ان دو ہفتوں کی قید تنہائی کے دوران پسینے اور خوف سے بُو دینے لگا تھا.. اور یہ سب کچھ ماچس کی ایک تیلی کا کیا دھرا تھا جو تاریک سیڑھیوں میں لمحہ بھر کے لیے بھڑک اُٹھی تھی..

شکاری بُرا شخص نہیں تھا.. اُس نے اسے پالا پوسا تھا.. لاڈ پیار کیا تھا.. بڑا کیا تھا.. اسے آزادی دی تھی ہر قسم کی لیکن اسے ذاتی پسند سے چناؤ کی حماقت کی آزادی نہیں دی تھی..

شکاری ہرگز کٹھور اور سخت گیر نہ تھا لیکن رواج کے بندھن اسے یوں باندھتے تھے کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی چمڑے کی بیلٹ کی ناکامی کے بعد میرا انتخاب کرنے پر مجبور ہو گیا تھا..

دونوں مجبور محض تھے..

میری لبلبی پر جس کی اُنگلی تھی وہ بھی اور میری نالی کے سامنے جو تھر تھر کانپتی لڑکی تھی وہ بھی..

ایک مجبور رواج کے بندھنوں میں بندھا ہوا بے بس تھا.. اور دوسرے کو عشق کا ہاتھی روند چکا تھا..

شکاری کی صرف ایک ہی شرط تھی کہ وہ جو اُس کے رُوں رُوں سے عشق بول رہا ہے وہ چپ ہو جائے..وہ جو جنگل بیلے میں کُوک اُٹھتی ہے اور کُوچہ بہ کُوچہ کُو بہ کُو جاتی ہے وہ خاموش ہو جائے..اور ان بولوں اور کُوکوں کی بجائے وہی خاموشی لوٹ آئے جو ایک بھرے پُرے مطمئن اور آسودہ خاندان میں پہلے ہوا کرتی تھی..

لیکن وہ جو تھی میری اُٹھی ہوئی نالی کے سامنے جو تھی..وہ اگرچہ تھر تھر کانپے چلی جا رہی تھی..اس کی کچی چھاتیوں میں خوف کے دودھ خشک ہوتے تھے..اُس میں فوری طور پر باتھ روم جانے کی حاجت زور مارتی تھی..وہ موت کے لیے تیار نہ تھی..لیکن وہ بے اختیار ہو چکی تھی..روندی جا چکی تھی اس لیے بے بس تھی..ہر مُوئے بدن سے اٹھنے والی کُوک کا گلا گھونٹنے پر قادر نہ تھی..چاہتی تو بھی شکاری کی خواہش اور دھمکی کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کر سکتی تھی..

ہاں..میں جو شکاری کی بندوق ہوں اقرار کرتی ہوں کہ مجھے..ایک حیرت ہوئی..اس ایک حیرت کا سبب یہ تھا کہ شکاری آسمان کے نیلے تالاب میں بلندیوں پر تیرتی مرغابیوں میں سے کسی ایک کا چناؤ کر کے اُسے بے جان کر کے نیچے اپنے قدموں میں لا سکتا تھا..اب وہی شکاری ایک اتنے بڑے اگرچہ تھر تھر کانپتے نشانے کی جانب اور بہت قربت میں..اتنی قربت میں کہ تھر تھر کانپتے نشانے کو محض ایک پتھر سے سنگسار کیا جا سکتا تھا..وہی شکاری شست باندھتے ہوئے..میری نالی کا رُخ اس دل کی جانب نہ کرتا تھا جو روندا جا چکا تھا بلکہ ذرا پرے کرتا تھا..

موت کے ڈر سے مسلسل جھنجھوڑے جانے والے بدن کی آنکھیں اس ذرا سے فرق کو نہیں جان سکتی تھیں..صرف میں جان سکتی تھی..

جب اس نے میری لبلبی کو دبایا تو مجھ میں سے جنم لینے والے دھماکے کی شدت سے صحن کی دیواروں سے چمٹی ہوئی بیل کی ایک لڑی اینٹوں کا ساتھ چھوڑ کر لٹک گئی..بے جان ہو گئی..اس بیل کو جو صحن کی دیوار سے ایک مدت سے چپکی ہوئی چپ اور شانت تھی اسے بھی میری نالی میں سے برآمد ہونے والے یکدم دھماکے کی عادت نہ تھی..اس فائر نے اسے ہلاک کر دیا..حالانکہ اس کی جانب تو میرا رُخ بھی نہ تھا..اور جس کی جانب میرا رُخ تھا اس کا خون چھینٹے اڑاتا ہوا بیل کے ہر پتے پر گرا..بھربھری اینٹوں کو مزید سرخ کر گیا..اندر..گھر کے اندر بیٹھی ہوئی منتظر ماں کے چہرے پر گرا..اس نے اپنی بیٹی کے خون کو چہرے سے پونچھا اور انگلیوں کو سرخ گیلاہٹ میں تر بہ تر پا کر چیخنے لگی..اگرچہ اس کی چیخ اندرونی تھی سنائی نہ دیتی تھی صرف منہ کھلا تھا اور جھرّیاں ایک دوسرے

کے قریب آتی تھیں..

اس کا خون چھینٹے اڑاتا ہوا بیل کے ہر پتے پر گرا اور وہ جو میری نالی کے سامنے تھرتھراتی تھی گر گئی.. صحن کے فرش پر ڈھیر ہو گئی..

لیکن میری گولی نے اسے نہیں گرایا تھا کہ وہ اس کے کُوکتے دل سے بہت پرے ہو کر نکل گئی تھی اور اس کی معصوم پشت پر جو ایک سبز پینٹ والا.. متعدد بار پینٹ ہو چکا دروازہ تھا اس میں چھید کر کے نکل گئی تھی.. شکاری نے جان بوجھ کر نشانہ خطا کیا تھا.. چاہتا یہی تھا کہ وہ موت کے ڈر سے سرِ تسلیم خم کر دے..

وہ گری تو چند لمحوں کے لیے گویا وہ ایک ایسی چڑیا ہوئی جس کا چڑیا دل بہت فاصلے پر ہونے والے کسی دھماکے کی تاب نہ لا کر بند ہو جاتا ہے اور وہ درخت سے گر جاتی ہے..

وہ اس مچھلی کی مانند ہوئی جس کے پانیوں میں کہیں دُور بارود کا ایک دھماکہ ہو تو وہ اس کی دہشت سے ہی زندگی ترک کر کے پانیوں پر اوندھی ہو کر بے جان تیرنے لگتی ہے..

وہ گری تو تادیر گری رہی..

ایک چڑیا.... ایک مچھلی کی طرح یکدم بے جان ہو کر گر تو گئی لیکن جب تادیر گری رہی.. تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے دو ہفتوں کے پسینے بھرے خوف کے مارے زرد پیراہن کے اندر اس کا چڑیا دل ابھی تک دھڑک رہا ہے.. وہ مری نہیں ہے اور اپنا کچا ان چھوا بدن ٹٹولنے پر اسے احساس ہوا کہ خون کے وہ چھینٹے جو اُڑے تھے.. بیل کے پتوں پر پڑے تھے.. ماں کے چہرے پر گرے تھے وہ دھماکے کی دہشت تھے.. حقیقت نہ تھے.. اور یہ محض ایک اتفاق نہ تھا.. بلکہ شکاری جب شست باندھتا تھا.. ہلاکت کے نشانے لیتا تھا تو.. شکاری نہ رہا تھا' باپ ہو گیا تھا.. اور وہ گری تھی تو دھماکے کے صدمے کے باعث گری تھی..

وہ تادیر گری رہی..

وہ کب تک گری رہتی.. اس کی بھی ایک انا تھی.. پھر سے کھڑی ہو گئی... لرزتی.. کانپتی.. ٹانگوں میں بدیاں نہیں گودا ہے.. بھوک اور ناتوانی سے ہلدی کی طرح زرد چہرے کے ساتھ جب کہ اس کے پپڑیوں جمے ہونٹ خوف سے ترچھے ہو رہے تھے وہ پھر سے کھڑی ہو گئی..

وہ ایک ڈھیٹ چہرہ تھا..

ایک ضدی چہرہ تھا جسے میں نے اپنی نالی کے سامنے پھر سے کھڑے ہوتے دیکھا..

میری لبلبی اس کے بعد تین بار دبی.. میری نالی میں سے تین گولیاں نکلیں لیکن سب کی سب نشانے سے پرے لگیں.. دو دروازے کے پار اور ایک بیل کے دیوار سے اُکھڑے ہوئے پتّوں کو تار تار کرتی ہوئی..

لیکن پہلے دھماکے کے بعد وہ دوبارہ نہیں گری.. اگرچہ دیوار سے چمٹی بیل کی ایک لڑی نہیں بلکہ پوری کی پوری بیل اُکھڑ کر نیچے صحن میں آ گری... یوں مردہ ہو کر گری کہ آئندہ دنوں میں گھر والوں نے بہت کوشش کی وہ کسی نہ کسی طرح پھر سے دیوار میں جڑیں پکڑ لے اس کے ساتھ چپک جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا.. وہ ہمیشہ کے لیے خشک اور مردہ ہو گئی اور دیوار کی ہر اینٹ اس کے وچھوڑے میں ننگی اور بدنما ہو گئی..

وہ کھڑی رہی.. دو ہفتوں سے ان دھوئے چہرے پر آنسو دھیرے سے بہتے میل میں سے رستہ بناتے تھے.. وہ میرے سامنے کھڑی رہی۔

تب شکاری پر کھلا کہ وہ تو اس کی بیٹی ہے.. اس کی مانند ہٹ دھرم اور ضدی.. وہ جان گیا کہ وہ جان سے چلی جائے گی..

وہ یہ بھی جان گیا کہ وہ خود بھی اتنی بے اختیار ہے کہ اپنے کسی ایک کُوکتے مُو کو بھی چپ نہیں کرا سکتی.. وہ اسے ہلاک بھی کر دے گا تو اس کا ہر موئے بدن پھر بھی بے جان نہ ہو گا.. بولتا رہے گا.. اس پکار کو ختم کرنے کا اب ایک ہی طریقہ تھا کہ اسے ہراساں اور بدگمان کیا جائے۔ اس کے بارے میں جس کی انگلیوں نے باون تیلیوں میں سے ایک کو ڈبیا کے کفن میں سے نکال کر روشن کر دیا تھا.. اور یہ وہی تھا جو اس کے ہر مُو سے بولتا تھا..

وہ جو موت کے خوف سے خالی ہو جائے' اسے بدگمانی کے زہر سے بھر دیا جائے.. اس سے کسی نہ کسی طور ایک خط لکھوایا جائے جس میں پسپائی کا اقرار ہو..

یہ حربہ بھی کارگر نہ ہوا اور اسے پھر سے اسی تعفن سے بھرے کمرے میں واپس دھکیل دیا گیا..

لیکن انہوں نے.. شکاری نے اور ماں نے زچ ہو کر ایک اور ترکیب سوچی..

اس ترکیب کی کامیابی کا انحصار صرف اس بات پر تھا کہ بنجر شخص کے دل میں.. اس موت کے خوف کو.. اس کی موت کے خوف کو ڈالا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے.. اگر وہ اس خوف سے پسپائی اختیار کر لیتا ہے تو پھر لامحالہ وہ بھی اس سے بدگمان ہو جائے گی..

چنانچہ یہی لائحہ عمل اختیار کیا گیا..

بنجر شخص تک یہ مصدقہ اطلاع پہنچا دی گئی کہ شکاری شست باندھ چکا ہے..اب کی بار خون کے چھینٹے حقیقت ہوں گے..وہ مردہ بیل کے پتوں پر ہی نہیں ایک طویل مسافت میں اُڑان کرتے ہوئے اس کے بنجر چہرے پر پڑیں گے اور وہ جتنے دیر میں انہیں پونچھے گا..وہ مر چکی ہوگی..

یہ جو تھی اس کا کوئی نام نہ تھا سوائے اس کے کہ اس کے ہر موئے بدن میں سے وہ بولتا تھا..وہ جو بقول اس کے بزدل ہو گیا تھا..

اس نڈھی کا کوئی نہ کوئی نام تو ہونا چاہیے..کسی ایسی بلندی کا نام جس کی برف دھوپ کی شدت کے باوجود پگھلنے سے انکاری ہو جاتی ہے..دھوپ اور گرمی کے برچھوں کے آگے سینہ تانے کھڑی رہتی ہے اور اُس کے انجماد میں سے ایک قطرہ بھی پسپائی کا نہیں گرنے پاتا..ایسی بلندی کا کیا نام ہو سکتا ہے..

تو یہ شاہ گوری بھی تو ہو سکتی ہے جس کے راستے میں خوبانیوں سے بھرا ایک درخت ہے..نالے کے پار بدخشانی گھوڑے پر سوار ایک ڈاکیا ہے..

تو وادیٔ شگر سے پرے..حشوپی کے سیبوں کے باغوں سے آگے خوبانیوں سے بھرے پُرے زرد سورجوں سے آراستہ دمکتے پیڑ سے پرے..ایک پُرشور نالے کے پار جو ڈاکیا آ رہا ہے تو کیا اسی کا..شکاری کی بیٹی کا آخری خط لاتا ہے جس میں مردہ شاعرہ کا شعر درج ہے..

''صاحب..یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہاں سکردو سے پانچ گھنٹے کی مسافت پر وادیٔ شگر سے آگے اس لمحے جب آپ میرے سامنے آئے ہو تو کوئی شخص یہ جان گیا ہو کہ آپ اس لمحے یہاں سے گزریں گے تو وہ آپ کو اس پل دو پل کے پتے پر..ایک عارضی لمحاتی پتے پر خط لکھ دے..کون لکھ سکتا ہے؟''

ڈاکیے کو پتہ نہیں..

اُس کو کیا پتہ کہ وہ بدگمان تھرتھراتے بدن والی لڑکی یہ جانتی ہے کہ اس نے آئندہ زندگی میں کس ساعت کس لمحے کہاں ہونا ہے..وہ غیب کا علم رکھتی ہے..اس لیے کہ اس کی ہر مُوئے بدن سے وہ اب بھی بول رہا تھا..اور نہ تو چمڑے کی بیلٹ اُسے شکاری کے راہ راست پر لا سکی ہے اور نہ ہی بیکال بندوق کی کوئی گولی..چاہے وہ نشانے پر بھی لگ جائے..تب بھی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتی..

کہ اسے عشق کا ہاتھی روند چکا تھا..

اگر چہ مہاوت دہائی دے رہا تھا کہ.. پوش کر یندا پوش..راستے سے ہٹ جاؤ.. پر وہ کھڑی رہی اور روندی گئی..

وہ راستے سے ہٹ تو سکتی تھی.. بدنامی' بیلٹ اور بندوق..ان میں سے کوئی ایک بھی اسے راستے سے ہٹانے کے لیے کافی تھی.. پر وہ ہٹی نہیں..

اُسی کا خط ہوگا..

اُس کے سوا اور کس کا ہو سکتا ہے..

ایک ایسا ہاتھ جس کی عمر اُس کے اپنے ہاتھ سے محض دس بارہ برس آگے کی ہوگی بہت دیر سے اپنے اختیار سے باہر اُنگلیوں کو اپنے بس میں لا کر ٹھنڈی ہو چکی چائے کی پیالی کے کُنڈے کو گرفت میں لانا چاہتا تھا اور انگلیاں انکاری ہو جاتی تھیں.. اور صرف لرزش نہ تھی جس کی بنا پر وہ ہاتھ چائے کی پیالی کے کُنڈے کو گرفت میں لینے سے قاصر ہو رہا تھا بلکہ اسے پکڑ کر منہ تک لے جا کر اس میں ٹھنڈی ہو چکی چائے کا گھونٹ بھرنے کی خواہش بھی اُس میں ذرّہ برابر نہ تھی.. بے دلی اور لرزش دونوں اس ناکامی کا سبب تھے.. محض دکھاوے کی خاطر وہ ہاتھ اُس پیالی کو پکڑ کر لبوں تک لے جانا چاہتا تھا اور ان لبوں کے پاس وہ خوشگوار فقرے نہ تھے جو ایک زیرِ زمین نیم تاریک ریستوران کی مصنوعی ٹھنڈک میں سامنے بیٹھے ہوئے کسی شخص سے کہے جاتے ہیں.. یہ ایک خوشگوار ملاقات ہرگز نہ تھی.. بہت دیر بعد وہ بولی تو اس کے ہونٹ اور اس کے پپوٹے بھی اُنگلیوں کی مانند لرزتے تھے اور وہ بولی ''وہ نہیں مانتی''..

اس کے سامنے زیرِ زمین ریستوران کی نیم تاریکی میں بیٹھی ہوئی درمیانی عمر کی گھریلو عورت میں اُس کی.. جس کا بدن چمڑے کی پیٹی سے اُدھڑا تھا اور شکاری نے جسے خوفزدہ کرنے کے لیے اپنی بیکال سے جان بوجھ کر نشانہ خطا کیا تھا اور جس کے دھماکے سے صحن کی بیل اُدھڑ گئی تھی.. اس کی شباہتیں تھیں.. خوش شکلی اسی کی تھی اور خمیدہ ہونٹ اسی کے تھے کیونکہ.. وہ اس کی ماں تھی..

''وہ ہماری بات نہیں مانتی.. تم پیچھے ہٹ جاؤ..''

عورت کے بال رنگے ہوئے تھے اور وہ اُس کی ہیئر ڈائی کے نمبر سے اس لیے واقفیت رکھتا تھا کہ وہ خود اس نمبر کے محلول سے اپنے کنپٹیوں پر سفید ہوتے بالوں کو رنگتا تھا..

عورت اپنے دُکھ.. غصے اور شدید نفرت کو دبانے کی سعی کرتی تھی تا کہ وہ عیاں ہو کر سامنے بیٹھے درمیانی عمر تک پہنچتے ہوئے شخص کو بدگمان نہ کریں..

وہ شاید پہلی بار اپنے صحن.. جس صحن کی دیواروں سے چمٹی بیلیں ایک دھماکے سے اُکھڑ گئی تھیں.. اپنے گھر سے نکل کر.. جس کے دروازوں پر دبیز چکیں اس میں مقیم نڈھی کے حسن کی رکھوالی کرتی تھیں.. وہاں سے نکل کر ایک ریستوران.. بلکہ کسی بھی ریستوران میں آ گئی تھی اسے سمجھانے.. اس کی منّت سماجت کرنے کہ وہ نہیں مانتی تم پیچھے ہٹ جاؤ..

''کیونکہ تم دونوں جو چاہتے ہو وہ ممکن نہیں.. بے شک اس کی جان بھی چلی جائے تب بھی ممکن نہیں ہوگا.. شکاری ہر بار جان بوجھ کر اپنا نشانہ خطا نہیں کرے گا.. تم چاہتے ہو کہ وہ مر جائے.. تمہیں اگر وہ عزیز ہے تو اسے خبر کیے بغیر پیچھے ہٹ جاؤ..''

اسے اپنا وجود گندی نالی میں رینگتے ہوئے ایک کیڑے سے بھی غلیظ لگ رہا تھا جس نے اس پاکیزہ اور نیک خصلت عورت کو اپنے صحن.. اپنے گھر سے باہر نکل کر اس کی منّت سماجت کرنے پر مجبور کر دیا تھا..

ریستوران میں بیٹھے ہوئے لوگ ان پر ایک اچٹتی نظر ڈالتے تھے اور کم روشنی کے باعث ان کی عمروں کے معمولی فرق کو پرکھنے سے قاصر تھے اور یہی خیال کرتے تھے کہ وہ ہم عمر ہیں..

محض ایک دیا سلائی کے بھڑکنے سے.. باون دیا سلائیوں میں سے کسی ایک کے جل اٹھنے سے وہ شرمندگی کی ان حدوں تک پہنچ گیا تھا..

وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا کہ.. پیچھے بھی وہ تھی..

اس کے اختیار میں کچھ نہ تھا.. وہ حیوان ہو چکا تھا اور اس کے بس میں کچھ بھی نہ تھا.. سوائے اس کے کہ وہ شرمندہ ہو کر گندی نالی میں رینگتے ہوئے کیڑے کی مانند ہو جائے..

ایک بار جب منصور انا الحق کا نعرہ لگا دے تو اس کے بعد وہ انحراف کرنے کے قابل نہیں رہتا.. بے شک وہ ایسا کرنا بھی چاہے تو بھی..

اس کے دائیں ہاتھ کی پشت کے جوڑ پر ایک پٹی بندھی ہوئی تھی اس لیے وہ چائے کی پیالی بائیں ہاتھ سے اٹھا کر منہ کے قریب لاتا تھا اور گھونٹ بھرنے کے بعد اسے قطعی طور پر احساس نہیں ہوتا تھا کہ چائے گرم ہے یا یخ ہو چکی ہے..

دائیں ہاتھ پر بندھی پٹی کے نیچے جو زخم تھے ان میں شیشے کی کرچیاں ابھی تک موجود تھیں اور ان کی چبھن زخمی ماس کو چھیلتی برداشت سے باہر ہوتی تھی.. یہ زخم کل رات اس نے اپنی مرضی سے وصول کیا تھا..

حافظ ہاتھی عشق دا.. جب جُثے کو روندتا ہے تو وہ بے حس ہو جاتا ہے۔ اُس میں اگرچہ خون دوڑتا رہتا ہے لیکن رگیں شریانیں کسی قدیم جنگل کے فرش پر گری سوکھی ٹہنیوں اور شاخوں کی مانند مُردہ ہو جاتی ہیں..

کل رات....

کل رات بستر پر لیٹے وہ اپنی چارپائی سے جُڑی ہوئی بند کھڑکی کے ان شیشوں کو گھورتا تھا جن پر کسی اناڑی رنگ ساز نے سبز پینٹ کر دیا تھا اور اُن کے آر پار نہیں دیکھا جا سکتا تھا..

اس کی آرزو اور جدائی کی اذیت جب اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو بند کر کے.. ایک مکّے کی صورت میں یک جا کر کے.. کھڑکی کے تیسرے شیشے پر وار کیا.. جو گھنا سبز پینٹ ہو جانے کے باعث اندھا ہو چکا تھا.. اس کا بھنچا ہوا ہاتھ اس فریم کے پار گیا جس میں جڑا ہوا نابینا شیشہ اس صدمے سے کرچیوں میں بکھرا... ہاتھ چوکھٹ کے.. اس فریم کے پار گیا تو ہوا کے ایک جھونکے نے.. ہاتھ میں سے رِستے خون کی بُو سونگھی اور ٹھہر گیا.. یہ ہوا نہیں جانتی تھی کہ آرزو اور جدائی کے آزار سے آزاد ہونے کے لیے یہ ہاتھ خون آلود ہوا ہے..

ہوا ان پڑھ ہوتی ہے..

پڑھ نہیں سکتی.. ورنہ وہ اس خون آلود ہاتھ پر عشق سے روندے جانے والی بے بس کیفیت کی تحریریں پڑھ لیتی..

اُس نے کہا تھا.. جس کی شباہتیں وہ سامنے بیٹھی ہوئی عورت میں دیکھ رہا تھا.. میں تو صرف اُس ہوا میں سانس لینا چاہتی ہوں جس ہوا میں تم بھی سانس لیتے ہو.. میں اُس باتھ رُوم میں جھانکنا چاہتی ہوں جہاں تم شیو کرتے ہو.. شیو کرنے کے بعد جو لوشن لگاتے ہو اُس کی مہک اپنے نتھنوں میں اتارنا چاہتی ہوں.. ان برتنوں میں کھانا کھانا چاہتی ہوں جن میں تم کھا چکے ہوتے ہو.. جو تمہارے جھوٹے ہوتے ہیں.. تمہاری محض موجودگی کی ہمیشگی چاہتی ہوں.. ہاں رات کو سونے کے لیے مجھے ایک چارپائی درکار ہو گی.. بے شک وہ چارپائی جو تمہارے صحن کے ایک کونے میں

مدتوں سے موسموں کی گرمیاں' سردیاں' بارشیں اور جھکڑ سہتی سہتی اپنی ادوائن ڈھیلی کر چکی ہے.. کیا تم مجھے ایک چارپائی بھی مہیا نہیں کر سکتے..

سامنے بیٹھی عورت نے ایک بار اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ کی.. اس کی کلائی بھی اس کی بناوٹ رکھتی تھی اور اس کے آگے جو انگلیاں تھیں ان میں بھی وہی کومل مہین پن اور نزاکت تھی... کہیں وہ بڑھاپے کا میک اپ کر کے.. خود آپ ہی اس کے سامنے تو نہیں آ بیٹھی.. ان میں اتنی مشابہت تھی.. گھڑی پر نگاہ اس لیے اس نے کی.. کہ وہ اپنے خاوند اور آل اولاد سے چھپ کر یہاں تک آئی تھی اور گھر سے.. بلکہ اس صحن سے غیر موجودگی.. زندگی میں پہلی بار ہوئی تھی اور وہ مضطرب تھی.. خوف میں تھی کہ اس کے پاس اس غیر حاضری کا کوئی جواز نہ تھا..

وہ اس آدمی کو' جو اسے گھناؤنا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی بدروح' اپنے تئیں سمجھانے آئی تھی جس نے اس کی بیٹی کو.. جو ابھی ابھی ٹین ایج میں سے نکلی تھی.. اپنی اس.. بقول اس کے ساحرانہ اور مکارانہ گرفت میں لے لیا تھا.. جو چمڑے کی پیٹی اور شکاری کی بندوق سے بھی کھل نہ سکی تھی.. یہ ایسی گرفت تھی.. کھلتی نہ تھی..

وہ اسے ملنے تو آ گئی تھی.. کسی کو بھی اطلاع کیے بغیر لیکن وہ اس آدمی سے شدید نفرت کرتی تھی.. جس نے اس کے گھر کو.. اس کے صحن کو اجاڑ کر دیا تھا.. ایک اچھی بھلی ہموار زندگی میں ایسی دراڑیں ڈال دی تھیں جن کے اندر تباہی اور فنا کے سوا اور کچھ نہ تھا.. اس کی بیٹی نے.. بچپن کے اس منگیتر کو بھی فراموش کر دیا تھا جو ایک یورپی ملک میں نہایت متمول اور آبرومند زندگی گزار رہا تھا.. اور یہ کوئی زبردستی کا ناتہ نہیں تھا.. وہ اس کی پسند ہوا کرتا تھا.. لیکن اس گھناؤنے آدمی کے زندگی کے سمندر پر نمودار ہوتے ہی اس نے اپنی پسند راتوں رات یکسر بدل دی تھی اور اب کھڑکی کے اس شیشے کی مانند اندھی ہو گئی تھی جس پر پینٹ کر دیا گیا ہو..

''وہ میری اولاد ہے.. اور میں اسے تم سے بہتر جانتی ہوں.. تم نے تو اسے اب دیکھا ہے.. اور میں نے اسے پالا ہے.. کھلایا ہے.. میں بہتر جانتی ہوں.. وہ کچھ کچھ فاتر العقل اور سادہ ہے.. بچپن کی منگنی اس کی مرضی سے ہوئی تھی ہم نے اسے مجبور نہیں کیا تھا اور وہ بہت خوش تھی... اب تمہیں ملنے کے بعد اس کے دماغ میں خلل آ گیا ہے..''

وہ سر جھکائے سنتا رہا.. ایک شرمندہ نالی میں رینگنے والا کیڑا تھا.. وہ سنتا رہا..

''وہ پچھلے ہفتے گھر سے بھاگ گئی تھی..''

''بھاگ گئی تھی..'' اس نے چونک کر کہا..

''ہاں..''

''کہاں؟''

''وہ ایک ڈری ہوئی خوف کی ماری کبوتری کی مانند تھی.. جب اس کے باپ نے اسے چمڑے کی پیٹی سے پیٹا تھا تو ایسی ڈری.. وہ بہت چھوٹی ہے.. بچّی ہے.. ایسی ڈری کہ گھر سے نکل کر ہمسائیوں کے گیٹ کو کھول کر لرزتی کانپتی ان کے ہاں چلی گئی کہ مجھے بچا لیجیے.. اور یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ ایسی شکل کی ہے کہ ہمسائیوں میں سے کوئی ایک شخص تھا جو اس کی آرزو رکھتا تھا اور وہ بہت خوش ہوا لیکن وہاں جا کر بھی اس نے بلند آواز سے تمہارا نام پکارا.. تو تم دیکھ سکتے ہو کہ وہ سوچنے سمجھنے سے عاری ہو چکی ہے..'' عورت نیم تاریک ریستوران میں ایک ایسی سرگوشی میں بولتی رہی جس کے کچھ لفظ سنائی دیتے ہیں لیکن بیشتر کھو جاتے ہیں..

''مجھے معاف کر دیجیے..'' اس نے بمشکل کہا..

''میں تمہارے بھلے کی ہی بات کرتی ہوں..''

''میرے بھلے کی؟''

''ہاں.. دیکھو وہ ایک جذباتی اور متلون مزاج لڑکی ہے.. اتنی کہ پل بھر میں کچھ اور دوسرے پل میں کچھ اور... کہ وہ تمہیں بھی چھوڑ سکتی ہے..''

''نہیں..''

''اگر وہ اپنی پسند کے منگیتر کو چھوڑ سکتی ہے تو تمہیں بھی.. تیاگ سکتی ہے..''

''نہیں..''

''ہاں.. وہ میری اولاد ہے.. میں اسے جانتی ہوں.. کہ اس کی طبیعت میں سیمابیت ہے.. وہ لمحوں میں بدل جاتی ہے.. بچپن میں وہ کسی ایک کھلونے کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی.. اس کے بغیر سو نہیں سکتی تھی.. اور پھر اگلے روز وہ اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیتی تھی اور پھر کبھی اس کے بارے میں سوچتی بھی نہ تھی.. وہ ایسی ہے..''

''جی..''

''تم بھی اس کے لیے ایک اور کھلونا ہو.. ایک ذہنی یا جسمانی باڑھ ہو.. کسی بھی لمحے وہ اس باڑھ کو پار کر جائے گی.. وہ تمہیں چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ چلی جائے گی..''

''کسی اور کے ساتھ؟''

''ہاں..''

''نہیں..''

''ہاں..میں اس کی ماں ہوں۔''

''وہ آپ کی بیٹی ہے..آپ اس کے بارے میں اتنے بے رحم الفاظ کیوں استعمال کرتی ہیں؟''

''اس لیے کہ میں اپنی بیٹی کو جانتی ہوں..''

''میرا خیال ہے کہ آپ نہیں جانتی..''

''آپ کا خیال ہے کہ..آپ جانتے ہیں؟''

''ہاں..''

''ایک ماں سے زیادہ جانتے ہیں..جان سکتے ہیں؟'' اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کو پھر سے دیکھا'' مجھے بہر صورت دو بجے کی بس پر سوار ہو کر واپس اپنے شہر پہنچا ہے..لیکن وہ تمہیں بھی چھوڑ دے گی..''

''نہیں..''

''ہاں...یہ ایک وقتی اُبال ہے..اس نے بہر طور اُتر جانا ہے..اس عارضی ہیجان کے لیے تم...آپ..اسے اور ہمیں برباد نہ کریں..میں اپنے بیٹوں اور شوہر کو جانتی ہوں..وہ میری طرح آپ کی منّت سماجت کرنے والے نہیں..وہ اپنا مذہب بدل سکتے ہیں..تمہیں قبول نہیں کر سکتے۔''

ریستوران سے باہر آتے ہوئے اس نے ایک بخار آلود شرمندگی میں صرف اتنا کہا

''میں اسے خوش رکھوں گا..وہ میرے ساتھ خوش رہے گی..''

''کیا خوشی اس لائق ہے کہ اس کے لیے اتنی بربادی ہو..اور بربادی ہوگی..''

باہر نیم اندھیرے ریستوران میں سے نکل کر تیز روشنی میں فٹ پاتھ پر جو لوگ چلتے تھے انہوں نے زیر زمین ریستوران سے برآمد ہونے والی اس عورت کے سراپے کی جانب ایک نظر نہ کی جس کے بال رنگے ہوئے تھے اور وہ زندگی میں پہلی بار گھر سے بغیر اطلاع اور بے جواز نکلی تھی..اور نہ اُس شخص کی جانب دیکھا جو سر جھکائے شرمندگی سے کبھی اس کے برابر میں اور کبھی پیچھے چلا آتا تھا..لوگ چلتے گئے..

اور وہ بھی چلتی گئی..

رنگے ہوئے بالوں والی..اس کی شباہت..اس کی کلائی اور اس کی اُنگلیاں رکھنے والی عورت چلتی گئی..دور ہوتی گئی..

ریستوران سے باہر آ کر..اس عورت کو دور جاتے دیکھ کر شرمندگی اور بے بسی نے اسے دوبارہ دبوچ لیا..

ہاتھ پر بندھی پٹّی میں سے تازہ خون رِسنے لگا....

جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی..

صرف اسے جس کی آنکھ میں ازل سے تصویریں بھر دی گئی ہوں .. ورنہ وہ محض شکلیں تھیں..

سوہنی' سسّی' صاحباں' بدیع الجمال اور ہیر سیال ایسی تو ہرگز نہ ہوں گی جیسی انہیں ہاشم شاہ' حافظ برخوردار' میاں محمد اور وارث شاہ نے دیکھا.. انہیں جو شکل نظر آئی محض اس لیے تصویر نظر آئی کہ ان کی آنکھوں میں ازل سے تصویریں بھر دی گئی تھیں.. ایک شکل میں حُسن کی مقدار اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ آپ کے آب و گل کے پیالے میں حُسن سنبھالنے کا ظرف ہوتا ہے..

جانے ان عشق میں تباہ حال شعر جوڑنے والوں نے انہیں کس حال میں دیکھا' اپنی اپنی لیلیٰ کو کیسے مجنوں کی نظر سے دیکھا' تب وہ یوں نظر آئیں ورنہ ان جیسی اور بھی تو بہت تھیں.. گجرات' بھنبھور' دانا باد اور کوہ قاف میں کال نہ تھا۔

جانے انہوں نے انہیں کس حال میں دیکھا۔

اس نے بھی اسے ایک ایسے ہی حال میں دیکھا کہ اس کی آنکھ میں بھی ازل سے ایک تصویر بھر دی گئی تھی .. یہ کیسا حال تھا؟ .. حال .. موجود سے الگ .. یکسر کٹا ہوا ایک مست الست بے اختیار کیفیت کا.. جو یکدم ایک سانحے ایک مرگ کی مانند یک لخت آپ کی زندگی کی روانی میں ایک ناقابل عبور اور فنا میں دھکیل دینے والی دراڑ ڈال دیتا ہے.. ایک ایسا حال.. جو گلے پڑ جاتا ہے .. اس سے چھٹکارا ممکن اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ آپ پر.. آپ کی من مرضی کے بغیر وارد ہو جاتا ہے اور آپ برنے کے چھتنار درخت سے جھولنے لگتے ہیں.. بے اختیاری کی کیفیت میں اس کی بلند ترین شاخوں کو چھونے لگتے ہیں.. حال بھی پڑ جاتا ہے..

گاؤں میں سردیوں کی.. ٹھنڈک کی منجمد راتیں ایسے اترتی اور پھر ٹھہر جاتی ہیں.. ایسے کہ کچی گلیوں کے درمیان بہتی گندی نالیوں کا سیاہ دانے دار کیچڑ بھی جمنے لگتا ہے اور اس میں رینگنے والے وہ کیڑے مکوڑے جو بطخوں کی زرد چونچوں سے بچ جاتے ہیں' سردی سے بے حس ہو جاتے ہیں۔ اگلی صبح تک جب دھوپ کی مرتی ہوئی حدّت انہیں پھر سے حرکت دے دیتی ہے..

جولاہوں کی ایک منڈلی ہوتی تھی جو سردیوں کی کسی ایک رات جمتی تھی.. گاؤں کے محلّے مختلف ذاتوں میں بٹے خودمختار ریاستوں کی مانند اپنی اپنی زندگی بسر کرتے تھے' بے آواز اور خاموش ہوتے تھے..

دن کے وقت وہ گاؤں کی زندگی کا ایک حصہ بن کر اپنی ثقافت کھو دیتے تھے' لیکن شام ہوتے ہی وہ اپنے اپنے محلّوں میں.. اپنے کچے کوٹھوں کے اندر اپنی خصلت اور خواہش میں آزاد ہو کر اپنی زندگی بسر کرتے تھے۔

ایک شیخوں کا محلّہ تھا.. جہاں دن کے وقت ایک منہ سے جھاگ نکالتا' بے بس اور عقل سے باہر شخص... شخص کیا.. ایک نوجوان لڑکا.. ہاتھ میں شیشہ پکڑے اپنی کلائیوں کو کریدتا ان میں سے خون نکالتا قہقہے لگاتا تھا.. اور محلے کے اندر وہ لوگ رہتے تھے جو سر شام دبک جاتے تھے.. سو جاتے تھے.. وہ کاروباری لوگ تھے.. بازار میں ان کی.. نالے پراندوں کی.. شربتوں کی اور کپڑے کی دکانیں تھیں۔ دکانیں تو نہیں' چھوٹے چھوٹے کھوکھے تھے جن میں وہ سارا دن چوکڑی مارے بیٹھتے تھے.. اور ہاں باجی.. جی آپا جی.. کالی آندھی خضاب دوں.. شلواروں کے لیے رنگین ازار بند دوں.. یا ایک سرگوشی سے.. بال صفا پوڈر دوں.. باجی..

ان شیخوں میں ڈر بہت تھا.. دبک جاتے تھے.. ڈر جاتے تھے..

اور پھر میراثی ہوتے تھے۔ گاؤں میں سب سے دیر سے جاگتے تھے.. دھوپ چڑھے جب گاؤں کے سب کوٹھے چارپائیوں سے ویران ہو جاتے تھے اور جب کاشت کرنے والے اور لوہے کوٹنے والے اور حجامت بنانے والے اور چارپائیاں ٹھونکنے والے سب کے سب اپنے کام کاجوں میں جتے ہوتے تھے' تب میراثی سوتے رہتے تھے... ان کا کام چوہدریوں کی باراتوں میں بھگتیں کرنا.. ان کے شجرۂ نصب پڑھنا اور ان کی آل اولاد کو دعائیں دینا اور ان کے رشتے کرانا تھا اور وہ ان فرائض سے سبکدوش ہو کر ایک قابل رشک نیند میں گم اپنے کوٹھوں پر دھوپ چڑھے سوتے رہتے تھے۔